یہ ہے میرا وطن

یوم مفتی اعظم ہند

مبارک حسین مصباحی

۳۱؍دسمبر ۲۰۰۹ء کی یہ ایک خمار آلود ٹھٹھری ہوئی شام تھی، کہرے کی دبیز چادر نے جامعہ اشرفیہ کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ جامعہ کی شاہراہوں پر لگی لائٹیں کسی طرح اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھیں، مگر طلبہ کے ہاسٹلوں میں عجیب گہما گہمی کا عالم تھا۔ جماعتِ سابعہ کے جواں سال طلبہ پر کسی سردی گرمی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ عزیزی ہاسٹل کے سامنے والے پارک کو پوری طرح ایک ہال میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ وسیع پنڈال کا داخلی حصہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ قدرے وسیع اور بلند اسٹیج اپنے معزز مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ طلبہ کی ایک ٹیم جب ہمیں لے کر اسٹیج کی جانب بڑھی تو مجمعِ شوق میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ دراصل اہم تقریبات میں بیرونی خطیب سے پہلے ماحول ساز گار کرنے کے لیے طلبہ ہمارا ہی استعمال کرتے ہیں اور ہم بہ دل وجان استعمال بھی ہوتے رہتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ یہ پروگرام صرف جماعتِ سابعہ کا نہیں بلکہ یہ سالانہ تقریب اپنے عظیم محسن کی بارگاہ میں جامعہ اشرفیہ کا مشترکہ خراج ہو جاتا ہے۔ اس پروگرام سے بریلی اور مبارک پور کے رشتوں کو تازگی ملتی ہے، تاریخ کے پٹ کھلتے ہیں، مفتیِ اعظم ہند کی نوازشِ خسروانہ کے کردار دہرائے جاتے ہیں، رضویات ونوریات پر فرزندانِ اشرفیہ کو مزید کام کرنے کے لیے مہمیز کیا جاتا ہے۔

اسٹیج پر پہلے ہی سے کچھ اساتذہ موجود تھے۔ ماہرین نے اسٹیج کو حجلۂ عروسی کی طرح سجایا تھا۔ اس میں ظاہری آرائش سے زیادہ اخلاص کی چاندنی کا حسن بے نقاب ہو گیا تھا۔ حدِ نظر کرسیوں پر بیٹھے طلبہ اپنی سلیقہ شعاری کا احساس دلا رہے تھے۔ شدید سردی کے باوجود ان کی اضطرابی کیفیت، ان کی بلند ذوقی کا اعلان کر رہی تھی۔ نعتوں اور منقبتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور ہم اسٹیج پر بیٹھے بٹھائے دو عشرے پیچھے چلے گئے، جب نہ جامعہ میں جنریٹر کا اہتمام تھا اور نہ یہ خوش نما پارک، نہ پکی سڑکیں تھیں اور نہ لکھنے لکھانے کی یہ گرم بازاری۔ بنا پلاسٹر کے ہاسٹل کی راہ داریاں بھی اوبڑ کھابڑ تھیں، مگر جامعہ کا تعلیمی اور فکری نظام اس وقت بھی صراطِ مستقیم پر گامزن تھا اور آج بھی اسی جذبۂ جنوں خیز کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ جامعہ اشرفیہ کے مجموعی نظامِ فکر کی انگلیاں ہمیشہ بدلتے حالات کی نبض پر رہی ہیں۔

یومِ مفتیِ اعظم ہند کا یہ حسین منظر دیکھ کر مجھے اپنا عہدِ طالب علمی یاد آ گیا، یہ کوئی ۱۹۹۰ء یا ۸۹ء کی بات ہوگی، جماعتِ سابعہ کے کچھ بلند حوصلہ طلبہ نے ایک میٹنگ کی، جس کی پیشوائی مولانا ذو الفقار خاں رام پوری کر رہے تھے۔ بہ اعتبارِ جماعت ہم اُن سے ایک سال سینیر تھے باقی تمام امور میں وہ ہم سے سینیر تھے۔ اس میٹنگ میں یہ طے پایا کہ جماعتِ سابعہ کے زیرِ اہتمام ''یومِ مفتیِ اعظم ہند'' کا انعقاد کیا جائے۔ طلبہ کے مابین تحریری اور تقریری مسابقے کے لیے عنوانات آویزاں کر دیے گئے۔ مفتی زاہد علی سلامی بھی اتفاق سے ان دنوں شعبۂ تحقیق میں زیرِ تعلیم تھے۔ ہم وطنی اور ہم مزاجی کے نتیجے میں ہم لوگوں کی محفلیں بزمِ طنز ومزاح سے عبارت ہوتی تھیں، ویسے بھی غم غلط کرنے کے لیے چند ساعت صحبتے بہ سلامی نسخۂ کیمیا ہوتی ہے۔ سلامی صاحب جب مولانا ذو الفقار کو اپنے مخصوص لہجے میں ''خان صاحب'' کہہ کر پکارتے تھے تو خان صاحب کے پورے وجود پر تازگی اور سرشاری کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ لفظ ''خان صاحب'' سے ان کی پیشانی پر علامہ اقبال کی ''خودی'' ہویدا ہی نہیں بلکہ مجسم ہو جاتی تھی۔ خیر خان صاحب کی قیادت میں جماعتِ سابعہ نے بڑے شوق سے یومِ مفتیِ اعظم ہند کا اہتمام کیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، اس روایت کے تسلسل میں کبھی ناغہ نہیں ہوا، بلکہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا رہا اس کے نظم ونسق اور حسنِ اہتمام میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

چند سال سے اس تقریب میں ''توسیعی خطبہ'' کا بھی اضافہ ہو گیا ہے جس میں ہر سال طے شدہ موضوع پر کسی بلند فکر عالم یا کسی دانش ور پروفیسر کا خطاب ہوتا ہے۔ سنی مدارس کی دنیا میں اس بدعتِ حسنہ کے موجد کی حیثیت سے ہمارا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ علمی سلسلہ بھی اپنے یومِ آغاز سے آج تک جاری ہے۔ چند سالہ مدت میں جن حضرات کے خطابات ہوئے ہیں، ان کے نام اس طرح ہیں ــــ معروف فکشن نگار حضرت سید محمد اشرف مارہروی، ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم برکاتی، پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ، پروفیسر فاروق احمد صدیقی، پروفیسر نجم الہدیٰ پٹنہ، ڈاکٹر عرشی خان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا یٰسین اختر مصباحی۔

ان خطبات سے طلبہ اور اساتذہ نے استفادہ کیا۔ عصری اور دینی علوم کے ماہرین میں ربطِ باہم کی راہیں نکلیں، جامعہ اشرفیہ کا مشاہداتی تاثر

یونیورسٹیوں تک پہنچا۔ کیا ہی اچھا ہوا گر دیگر مدارس کے طلبہ اور اساتذہ بھی اس رخ پر قدم بڑھائیں۔

مفتیِ اعظم ہند علامہ شاہ مصطفیٰ رضا بریلوی خاندانی وجاہتوں کے ساتھ ذاتی فضائل و کمالات کے بھی بحر ناپیدا کنار تھے۔ وہ اپنے والد گرامی امام احمد رضا قدس سرہ کے حقیقی وارث تھے، ان کے فکر و نظر کے مبلغ و ترجمان تھے، شریعت و طریقت کے مسائل میں مرجعِ عوام و خواص تھے، جہانِ سنیت میں ان کی شخصیت حَکَم کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جماعتی درد رکھتے تھے، وہ مشربی زعمِ تعصب کی بوالعجبیوں پر جماعتی مفاد کو ترجیح دیتے تھے، شخصی خانقاہ اور شخصی ادارے سے بلند ہو کر سوچتے تھے۔ انھیں شخصیت سے زیادہ جماعتی بالادستی عزیز تھی۔ اس لیے ہر ادارہ، ہر خانقاہ اور ہر تحریک ان کا احترام کرتی تھی، ان کی باتوں پر سرِ تسلیم خم کرتی تھی اور سچ یہی ہے کہ شخصیت کی شناخت جماعت کے حوالے سے ہونا چاہیے نہ کہ جماعت کی شناخت شخصیت سے۔

جامعہ اشرفیہ مبارک پور خاکِ ہند میں اہلِ سنت کی سب سے بڑی درس گاہ ہے۔ اس کی وسیع خدمات کا دائرہ اب ایک صدی کو محیط ہو رہا ہے۔ اکابرِ اہلِ سنت اور مفتیِ اعظم ہند نے ہمیشہ اس کی وسعت و ترقی کے لیے دعائیں کی ہیں، اس کے تعاون کے لیے اپیلیں لکھی ہیں، یہ ان کی جماعتی ہمدردی کا ایک رخ ہے۔ اشرفیہ نوازی کے حوالے سے مجھے ان کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ مدرسہ فیض العلوم سرائے ترین سنبھل کے صدر حاجی محبوب رضوی نے ایک بار بیان کیا کہ ہم چند مریدین سنبھل سے سرکار مفتیِ اعظم ہند کے حضور حاضر ہوئے۔ ہم لوگ مؤدب بیٹھے اکتسابِ فیض کر رہے تھے، ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی ضرورت اور پریشانی بیان کر کے دُعا اور تعویذ لے رہا تھا۔ اسی درمیان سرکار مفتیِ اعظم ہند کا ایک شیدائی حاضر ہوا اور اس نے سلام و دست بوسی کے بعد عرض کیا: حضور! میرے پاس اپنی زکوٰۃ کی رقم ہے، اسے آپ کسی مناسب جگہ لگا دیں۔ حاجی محبوب رضوی کا بیان ہے کہ سرکار مفتیِ اعظم ہند نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ارشاد فرمایا: اس وقت دین و سنیت کا سب سے بڑا کام اشرفیہ، مبارک پور کر رہا ہے، آپ اپنی رقم مبارک پور بھجوا دیں۔ حاجی محبوب رضوی بیان کرتے ہیں کہ سرکار مفتیِ اعظم ہند کا یہ ارشاد سن کر ہمارے دلوں میں بھی جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے محبت بڑھ گئی۔

اس بار یومِ مفتیِ اعظم ہند میں توسیعی خطاب کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی کو مدعو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بجائے خطاب کے مقالہ پیش کیا، جسے علما اور طلبہ نے بے پناہ پسند کیا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے متعارف تو بہت پہلے سے تھا، کوئی خاص متاثر نہیں تھا، مگر اس مقالے نے میری سابقہ سوچ پر پانی پھیر دیا۔ در اصل ڈاکٹر صاحب نے اس بار مقالہ نگاری میں قلم کے ساتھ دل کا بھی خاصا استعمال کیا تھا اور دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ مقالے کا عنوان تھا ”اہلِ سنت و جماعت - انتشار و پسپائی کے اسباب اور ان کا تدارک“ ڈاکٹر فاروقی کے مصنفہ اور مرتبہ کتب و رسائل کی تعداد ۲۳/ ہے اور مختلف موضوعات پر مطبوعہ مضامین کی تعداد ۸۰/ تک پہنچ چکی ہے، جب کہ خود مصنف کو اس منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی بیس برس سے بھی زیادہ کا انتظار کرنا پڑے گا، اس لیے ان کے قلم سے ابھی بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔

قارئین کی تسکینِ خاطر کے لیے عرض ہے کہ ڈاکٹر فاروقی جلیل القدر صوفی اور بلند پایہ محدث و مفسر علامہ مبین الدین امروہوی کے اکلوتے فرزند ارجمند ہیں۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے بھی یہ نسبت ابنیت ہم نے اس لیے سپردِ قلم کر دی کہ بعض حضرات کے نزدیک کسی کبیر و شہیر کا بیٹا ہونا خود باپ سے بھی زیادہ فضیلت کی بات ہوتی ہے۔ حالاں کہ ایک کامیاب انسان کی حقیقی شناخت وہی ہے جو اس کے محنت کش ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فاروقی صاحب نے اہلِ سنت و جماعت کے انتشار و پسپائی کے اسباب کی تشخیص فرمائی اور تدارک کے لیے انتہائی مفید اور کارآمد نسخے بھی تجویز کیے۔ اس مقالے کو آپ ماہ نامہ اشرفیہ کے اسی شمارے سے پڑھنا شروع کر دیں گے، اس لیے اس پر تبصرہ اب آپ کی منصبی ذمہ داری بنتی ہے۔ سر دست ہم اہلِ سنت کی موجودہ پسپائی کے ایک اہم اور بنیادی سبب کی جانب آپ کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی جانب ڈاکٹر فاروقی کی نظر جاتے جاتے رہ گئی۔

صاحبو! بگوش و ہوش سنو! اہلِ سنت کے انتشار و پسپائی کا سب سے بڑا سبب جو سارے اسباب کی بنیاد ہے وہ ہے — فکر و عمل کا عدمِ توازن — جب کہ یہ ایک سچائی ہے کہ شخصیت کی تعمیر کا مسئلہ ہو یا جماعتی فلاح و بہبود کا قضیہ، فکر و عمل میں توازن کا برقرار رہنا بنیادی چیز ہے۔ فکر و عمل کے توازن کی صورت میں بڑے سے بڑا معرکہ معمولی کوشش سے حل کیا جا سکتا ہے اور عدمِ توازن کی صورت میں معمولی بار بھی پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ تقریبِ فہم کے لیے اسے آپ اس طرح سمجھیں - کبھی عہدِ لاشعوری میں کسی بازی گر کو آپ نے یہ کرتب دکھاتے دیکھا ہو گا۔ ایک رسی تنی ہوئی ہے، جس پر ایک بازی گر چل رہا ہے۔ بازی گر کے کاندھوں پر ایک کرسی ہے، کرسی پر ایک لڑکی ہے اور اس لڑکی کے ماتھے پر ایک سلاخ کھڑی ہے۔ اس انتہائی نازک صورتِ حال کے باوجود کرتب باز رسی پر چل رہا ہے۔ یہ سارا کرشمہ تمام اشیا میں توازن کی وجہ سے ہے۔ اگر باہم توزن بگڑ جائے تو پلک جھپکتے ہی سارا

کھیل زمیں بوس ہو جائے گا۔ یہی حال انفرادی اور اجتماعی زندگی کا بھی ہے۔ اس مقابلہ جاتی دور میں جماعتی سفر کی شاہ راہ اس بازی گر کی رسی سے بھی زیادہ نازک اور سنگین ہے، لیکن اگر تمام امور میں توازن برقرار رکھا جائے تو جماعتی وسعت وترقی کا سفر تیز بھی ہو سکتا ہے اور آسان بھی۔

جماعتی سطح پر عدم توازن کی صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نے اپنا ایک مخصوص جماعتی مزاج بنا رکھا ہے۔ حالات کے شدید تقاضوں کے باوجود بھی ہم اپنی روایتی ڈگر سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، حالاں کہ یہ ایک تجرباتی اور مشاہداتی سچائی ہے کہ فرد کی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، اس کے مختلف تقاضے اور لوازم ہوتے ہیں۔ ایک انفرادی زندگی کے لیے کھانا پینا بھی ضروری ہے اور رفعِ حاجت کے لیے جانا بھی، آب وہوا بھی ضروری ہے اور لباس ومکان بھی، تنہائی بھی ضروری ہے اور معاشرتی ربط وضبط بھی۔ اب اگر کوئی قسم کھالے کہ مجھے صرف کھانا پینا ہے، رفعِ حاجت کے لیے نہیں جانا ہے، یا زندگی بھر تنہا رہنا ہے معاشرتی زندگی غیر ضروری ہے، تو اس انسان کے اس فکری اور عملی عدم توازن کو دیکھ کر لوگ فیصلہ کر لیں گے کہ یہ شخص دماغی عدم توازن کا شکار ہے اور اس فیصلے کے بعد سماجی اور ملکی سطح پر لوگ اسے نظر انداز کر دیں گے۔

اب اسی طرح جماعتی زندگی کی تعمیر وترقی کے لیے دعوت وتبلیغ، تصنیف وتقریر، رشد وہدایت، سیاست وصحافت، تعلیم وتربیت، تحریک وتنظیم وغیرہ بہت سے امور ہیں اور ان میں سے ہر ایک بھرپور منصوبہ بندی اور مسلسل توجہ کا طالب ہے۔ مگر ہمارے یہاں بعض چیزوں پر ضرورت سے زیادہ توجہ ہے اور بعض چیزیں شجرِ ممنوعہ سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً مدارس کو دیکھ لیجیے، جن علاقوں میں ہمارے مدارس نہیں ہیں تو بالکل نہیں ہیں اور جن علاقوں میں یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے، وہاں دن بہ دن بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھ رہے ہیں۔ بس اساتذہ اور انتظامیہ میں ذرا شکر رنجی ہوئی اور پہلے مدرسے کی ٹھیک ناک کے سامنے ایک دوسرا مدرسہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے برخلاف تصنیفی اور تحقیقی اداروں کا بڑی حد تک فقدان ہے، ملی اور سیاسی میدان میں علمائے اہلِ سنت کی کوئی قابلِ ذکر نمائندگی نہیں۔ دعوت وتبلیغ کی پہلے کوئی تحریک ہی نہیں تھی۔ اب جو تحریکیں ملکی اور عالمی سطح پر کام کر رہی ہیں تو ان کی بے پناہ مخالفت کی جا رہی ہے۔ اس عہد میں خامیاں کس طبقے میں نہیں ہیں۔ کیا خطبہ، علما اور پیرانِ طریقت میں بہت سے لوگ قابلِ اصلاح نہیں ہیں؟ اب آپ بتائیں کہ ان کی باادب اصلاح کی جائے گی یا انھیں جماعت ہی سے خارج کر دیا جائے گا۔ مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے، یا گردن دبا کر موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے؟ اسی طرح پورے ملک میں اہلِ سنت وجماعت کا کوئی ملک گیر قابلِ ذکر اخبار نہیں۔ اب اس میڈیائی دور میں اہلِ سنت کی نمائندگی ہو تو کیسے؟ وہ تو کہیے، اہلِ پاکستان نے اہلِ سنت کی پیغام رسانی کی کچھ سبیلیں نکال لیں اور اہلِ سنت کی لاج بچ گئی۔

ایسا نہیں کہ علمائے اہلِ سنت جماعتی تقاضوں سے بے خبر ہیں۔ دراصل تساہلی اور فکر وعمل کے عدم توازن نے انھیں منفی فکر کا حامل بنا دیا۔ وہ عمل کے بجائے ردِّعمل کے عادی ہو گئے، جس کی وجہ سے غور کرنے اور عمل کرنے کی قدر کم کی جاتی ہے، اس پر تنقیدیں زیادہ کی جاتی ہیں۔ آپ کچھ نہ کریں کسی کو کوئی شکایت نہیں، اور کچھ کیجیے تو اس سے پہلے اپنوں کے شب وستم اور نشانۂ غضب بننے کا حوصلہ پیدا کیجیے ــــ یہ موضوع تفصیل طلب ہے بر وقت اتنا یاد رکھیں کہ ہمیں جماعتی سطح پر تمام گوشوں اور تمام شعبوں میں یکساں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ فکر وعمل کا یہ عدم توازن ہمارے جماعتی انتشار اور پسپائی کا ایک بنیادی سبب ہے۔ ہماری ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا یا ہمیں زہر میں بجھے ہوئے تیروں کا نشانہ بنایا جائے گا ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اب آگے ہمیں خود غور یہ کرنا ہے کہ: ع: کیا طرزِ سخن ہو کہ تو انکار نہ کر پائے۔

مگر ہمارے طرزِ سخن سے پہلے صدر الافاضل مرادآبادی کے طرزِ سخن کا اضطراب ملاحظہ کیجیے۔ سنیے تو سہی یہ خلفائے امام احمد رضا کی بزم کا سب سے بڑا مفکر ہے اور جماعتی فلاح وبہبود کے لیے علمائے اہلِ سنت سے کس دردمندی کے ساتھ منت وسماجت کر رہا ہے:

''ستم ہے کہ جاہل، عالم نما عالم بن کر میدان میں آئیں اور ان کی تعداد سے دنیا کو دھوکا دیا جائے اور ان کی خود رائی اور نفس پرستی کو علما کی رائے قرار دیا جائے اور علما کا پورا طبقہ کا طبقہ ساکت وخاموش بیٹھا یہ سب کچھ دیکھا کرے، نہ اس کے منہ میں زبان ہو، نہ زبان میں حرکت، نہ ہاتھ میں قلم، نہ قلم میں جنبش۔ اب آپ کا یہ تقاعدِ زہد وانکسار کی حد سے گزر کر غفلت وتکاسُل کے دائرے میں آ گیا ہے اور اس اندازِ سکوت سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اب آپ اس عقیدے کو چھوڑ دیجیے کہ آپ کے فرائض ایک مجلس میں وعظ کہہ کر یا ایک حلقہ میں درس دے کر یا ایک خلوت خانے میں فتویٰ لکھ کر ادا ہو جاتے ہیں اور آپ کو اس پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اور بدخواہانِ اسلام تخریب کے لیے کیا کیا تدابیر عمل میں لا رہے ہیں؟ یقیناً یہ آپ کا فرض ہے اور آپ سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اٹھیے اور اپنے فرض کو ادا کیجیے''

(ماہ نامہ السواد الاعظم مرادآباد۔ شمارہ رجب المرجب ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء) ☆☆☆